

# تفسیر القرآن

## النور

(۷)

یہ (منافق) اللہ کے نام سے کڑی کڑی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ آپ حکم دیں تو ہم گھروں سے نکل کھڑے ہوں۔ ان سے کہو قسمیں نہ کھاؤ، تمہاری اطاعت کا حال معلوم ہے۔ تمہارے کرتوتوں سے اللہ بے خبر نہیں ہے۔ کہو اللہ کے مطیع بنو اور رسول کے تابع فرمان بن کر رہو۔ لیکن اگر تم منہ پھیرتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ رسول پر جس فرض کا بار رکھا گیا ہے اس کا ذمہ دار وہ ہے اور تم پر جس فرض کا بار ڈالا گیا ہے اس کے ذمہ دار تم۔ اس کی اطاعت کر دو گے تو خود ہی ہدایت پاؤ گے۔ ورنہ رسول کی ذمہ داری اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ صاف صاف حکم پہنچا دے۔

اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو

اللہ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اہل ایمان سے جو اطاعت مطلوب ہے وہ معروف اور معلوم قسم کی اطاعت ہے جو ہر شے سے بالاتر ہو، نہ کہ وہ اطاعت جس کا یقین دلانے کے لیے قسمیں کھانے کی ضرورت پڑے اور پھر بھی یقین نہ آسکے۔ جو لوگ حقیقت میں مطیع فرمان ہوتے ہیں ان کا رویہ کسی سے چھپا ہوا نہیں ہوتا۔ ہر شخص ان کے طرز عمل کو دیکھ کر حوسوں کر لیتا ہے کہ یہ اطاعت گزار لوگ ہیں۔ ان کے بارے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں ہوتی کہ اسے رفع کرنے کے لیے قسمیں کھانے کی ضرورت پیش آئے۔

یعنی یہ فریب کاریاں مخلوق کے مقابلے میں تو شاید چل بھی جائیں مگر اس خدا کے مقابلے میں کیسے چل سکتی ہیں جو کھنے اور چھپنے سب حالات، بلکہ دلوں کے غرضی ارادوں اور خیالات تک سے واقف ہے۔

اُسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح اُن سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے ، اور اُن کے لیے اُن کے اُس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دے گا جسے اللہ نے اُن کے حق میں پسند کیا ہے ، اور اُن کی (موجودہ) حالت خوف کو ان سے بدل دے گا ، بس وہ میری بندگی کریں ، اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ اور جو اس کے بعد کفر کرے <sup>۵۴</sup> تو ایسے ہی لوگ ناسق ہیں۔ نماز قائم کر دو ، زکوٰۃ دو ، اور رسول کی اطاعت کرو ، امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔ جو لوگ کفر کر رہے ہیں

<sup>۵۳</sup> جیسا کہ اس سلسلہ کلام کے آغاز میں ہم اشارہ کر چکے ہیں ، اس ارشاد سے مقصود منافعتین کو متنبہ کرنا ہے کہ اللہ نے مسلمانوں کو خلافت عطا فرمانے کا جو وعدہ کیا ہے اُس کے مخاطب محض مردم شماری کے مسلمان نہیں ہیں بلکہ وہ مسلمان ہیں جو صادق الایمان ہوں ، اخلاق اور اعمال کے اعتبار سے صالح ہوں اللہ کے پسندیدہ دین کا اتباع کرنے والے ہوں ، اور ہر طرح کے شرک سے پاک ہو کر خالص اللہ کی بندگی و غلامی کے پابند ہوں۔ ان صفات سے عاری اور محض زبان سے ایمان کے مدعی لوگ نہ اس وعدے کے اہل ہیں اور نہ یہ ان سے کیا ہی گیا ہے۔ لہذا وہ اس میں حصہ دار ہونے کی توقع نہ رکھیں۔ بعض لوگ خلافت کو محض حکومت و فرمانروائی اور غلبہ و تمکّن کے معنی میں لے لیتے ہیں۔ پھر اس آیت سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جس کو بھی دنیا میں یہ چیز حاصل ہے وہ مومن اور صالح اور اللہ کے پسندیدہ دین کا پیرو اور بندگی حق پر عامل اور شرک سے مجتنب ہے ، اور اس پر مزید ستم یہ ڈھاتے ہیں کہ اپنے اس غلط نتیجے کو ٹھیک بٹھانے کے لیے ایمان ، صلاح ، دین حق ، عبادت الہی اور شرک ہر چیز کا مفہوم بدل کر وہ کچھ بنا ڈالتے ہیں جو ان کے اس نظریے کے مطابق ہو۔ یہ قرآن کی بدترین معنوی تحریف ہے جو یہود و نصاریٰ کی تحریفات سے بھی بازی لے گئی ہے۔ اس نے قرآن کی ایک آیت کو وہ معنی پہنا دیے ہیں جو پورے قرآن کی تعلیم کو منسوخ کر ڈالتے ہیں اور اسلام کی کسی ایک چیز کو بھی اس کی جگہ پر باقی نہیں رہنے دیتے۔ خلافت کی اس تعریف کے بعد لامحالہ وہ سب لوگ اس آیت کے مصداق بن جاتے ہیں جنہوں نے کبھی دنیا میں غلبہ و تمکّن پایا ہے یا آج پائے ہوئے ہیں ، خواہ وہ خدا ، وحی ، رسالت ، آخرت ہر چیز کے منکر ہوں اور فسق و فجور کی ان تمام آلائشوں میں بُری طرح لپٹے ہوئے ہوں جنہیں قرآن نے کباثر

تقوید دیا ہے ، جیسے سود ، زنا ، شراب اور جوا۔ اب اگر یہ سب لوگ مومن صالح ہیں اور اسی لیے خلافت کے منصب عالی پر سرفراز کیے گئے ہیں تو پھر ایمان کے معنی قوانینِ طبیعی کو مانتے اور صلاح کے معنی انی قوانین کو کامیابی کے ساتھ استعمال کرنے کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں ؟ اور اللہ کا پسندیدہ دین اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ علومِ طبیعی میں کمال حاصل کر کے صنعت و حرفت اور تجارت و سیاست میں خوب ترقی کی جائے؟ اور اللہ کی بندگی پھر اس کے سوا اور کیا رہتی ہے کہ ان قاعدوں اور ضابطوں کی پابندی کی جائے جو انفرادی اور اجتماعی سعی و جہد کی کامیابی کے لیے فطرتاً مفید اور ضروری ہیں ؟ اور شرک پھر اس کے سوا اور کس چیز کا نام رہ جاتا ہے کہ ان مفید قواعد و ضوابط کے ساتھ نقصان دہ طریقوں کی آمیزش کی جائے۔ مگر کیا کوئی شخص جس نے کھلے دل اور کھلی آنکھوں سے کبھی قرآن کو سمجھ کر پڑھا ہو ، یہ مان سکتا ہے کہ قرآن میں واقعی ایمان اور عمل صالح اور دین حق اور عبادتِ الہی اور توحید اور شرک کے یہی معنی ہیں ؟ یہ معنی یا تو وہ شخص لے سکتا ہے جس نے کبھی پورا قرآن سمجھ کر نہ پڑھا ہو اور صرف کوئی آیت کہیں سے اور کوئی کہیں سے لے کر اس کو اپنے نظریات و تصورات کے مطابق ڈھال لیا ہو ، یا پھر وہ شخص یہ حرکت کر سکتا ہے جو قرآن کو پڑھتے ہوئے ان سب آیات کو اپنے زعم میں سرسری غور اور غلط قرار دیتا چلا گیا ہو جن میں اللہ تعالیٰ کو واحد رب اور اللہ اوصاف کی نازل کردہ وحی کو واحد ذریعہ ہدایت اور اس کے مبعوث کردہ ہر پیغمبر کو حتمی طور پر واجب الطاعت رہنما تسلیم کرنے کی دعوت دی گئی ہے ، اور موجودہ دنیوی زندگی کے خاتمے پر ایک مددگار زندگی کے محض مان لینے ہی کا مطالبہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہ بھی صاف صاف کہا گیا ہے کہ جو لوگ اس زندگی میں اپنی جواب دہی کے تخیل سے منکر یا خالی الذہن ہو کر محض اس دنیا کی کامیابیوں کو مقصود سمجھتے ہوئے کام کریں گے وہ فلاح سے محروم رہیں گے۔ قرآن میں ان مضامین کو اس قدر کثرت سے اور ایسے مختلف طریقوں سے اور ایسے صریح و صاف الفاظ میں بار بار دہرایا گیا ہے کہ ہمارے لیے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ اس کتاب کو ایمانداری کے ساتھ پڑھنے والا کوئی شخص کبھی ان غلط فہمیوں میں بھی پڑ سکتا ہے جن میں آیت اختلاف کے یہ نئے مفسرین مبتلا ہوئے ہیں۔ حالانکہ لفظِ خلافت و استخلاف کے جس معنی پر انہوں نے یہ ساری عمارت کھڑی کی ہے وہ ان کا اپنا گھڑا ہوا ہے ، قرآن کا جاننے والا کوئی شخص اس آیت میں وہ معنی کبھی نہیں لے سکتا۔

قرآنِ خلافت اور اختلاف کو تین مختلف معنوں میں استعمال کرتا ہے اور ہر جگہ سیاق و سباق سے پتہ چل جاتا ہے کہ کہاں کس معنی میں یہ لفظ بولا گیا ہے۔ اس کے ایک معنی ہیں "خدا کے دیئے ہوئے اختیارات کا حامل ہونا"۔ اس معنی میں پوری اولادِ آدم زمین میں خلیفہ ہے۔ دوسرے معنی ہیں "خدا کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے امرِ شرعی (تہ کہ محض امرِ تکوینی) کے تحت اختیاراتِ خلافت کو استعمال کرنا"۔ اس معنی میں صرف مومن صالح ہی خلیفہ قرار پاتا ہے، کیونکہ وہ صحیح طور پر خلافت کا حق ادا کرتا ہے۔ اور اس کے برعکس کافر و فاسق خلیفہ نہیں بلکہ باغی ہے، کیونکہ وہ مالک کے ملک میں اس کے دئے ہوئے اختیارات کو نافذ کرنا کے طریقے پر استعمال کرتا ہے۔ تیسرے معنی ہیں "ایک دور کی غالب قوم کے بعد دوسری قوم کا اس کی جگہ لینا"۔ پہلے دونوں معنی خلافت بمعنی "نیابت" سے ماخوذ ہیں، اور آخری معنی خلافت بمعنی "جانشینی" سے ماخوذ۔ اور اس لفظ کے یہ دونوں معنی لغتِ عرب میں معلوم و معروف ہیں۔ اب جو شخص بھی یہاں اس سیاق و سباق میں آیتِ اختلاف کو پڑھے گا وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس امر میں شک نہیں کر سکتا کہ اس جگہ خلافت کا لفظ اس حکومت کے معنی میں استعمال ہوا ہے جو اللہ کے امرِ شرعی کے مطابق اس کی نیابت کا ٹھیک ٹھیک حق ادا کرنے والی ہو۔ اسی لیے کفار تو درکنار، اسلام کا دعویٰ کرنے والے منافقوں تک کو اس کے وعدے میں شریک کرنے سے انکار کیا جا رہا ہے، اسی لیے فرمایا جا رہا ہے کہ اس کے مستحق صرف ایمان اور عملِ صالح کی صفات سے متصف لوگ ہیں، یہی لیے قیامِ خلافت کا ثمرہ یہ بتایا جا رہا ہے کہ اللہ کا پسند کردہ دین، یعنی اسلام مضبوط بنیادوں پر قائم ہو جائے گا اور اسی لیے اس انعام کی شرط یہ بتائی جا رہی ہے کہ خالص اللہ کی بندگی پر قائم رہو جس میں شرک کی ذرہ برابر آمیزش نہ ہونے پائے۔ اس وعدے کو یہاں سے اٹھا کر بین الاقوامی چوراہے پر لے پہنچنا اور امریکہ سے لے کر روس تک جس کی کبریائی کا بھی ڈنکا دنیا میں بج رہا ہو اس کے حضور اسے نذر کر دینا جمالت کی طغیانی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

اس جگہ ایک ادبات بھی قابل ذکر ہے۔ یہ وعدہ بعد کے مسلمانوں کو تو بالواسطہ پہنچا ہے، بلاواسطہ اس کے مخاطب وہ لوگ تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمد میں موجود تھے۔ وعدہ جب کیا گیا تھا اس وقت واقعی مسلمانوں پر حالتِ خوف طاری تھی اور دینِ اسلام نے ابھی حجاز کی زمین میں بھی مضبوط جڑ نہیں پکڑی تھی

ان کے متعلق اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ وہ زمین میں اشد کو عاجز کر دیں گے۔ ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بڑا ہی برا ٹھکانا ہے

اس کے چند سال بعد یہ حالت خوف نہ صرف امن سے بدل گئی بلکہ اسلام عرب سے نکل کر ایشیا اور افریقہ کے بڑے حصے پر چھا گیا اور اس کی جڑیں اپنی پیدائش کی زمین ہی میں نہیں، کمرہ زمین میں جم گئیں۔ یہ اس بات کا تاریخی ثبوت ہے کہ اشد تعالیٰ نے اپنا یہ وعدہ ابو بکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم کے زمانے میں پورا کر دیا۔ اس کے بعد کوئی انصاف پسند آدمی مشکل ہی سے اس امر میں شک کر سکتا ہے کہ ان تینوں حضرات کی خلافت پر خود قرآن کی مہر تصدیق لگی ہوئی ہے اور ان کے مومن صالح ہونے کی شہادت اشد تعالیٰ خود دے رہا ہے۔ اس میں اگر کسی کو شک ہو تو وہ نہج البلاغہ میں سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی وہ تقریر پڑھ لے جو انھوں نے حضرت عمر کو ایرانیوں کے مقابلے پر خود جانے کے ارادے سے باز رکھنے کے لیے کی تھی۔ اس میں وہ فرماتے ہیں :

”اس کام کا فروغ یا ضعف کثرت و قلت پر موقوف نہیں ہے۔ یہ تو اشد کا دین ہے جس کو اس نے فروغ دیا اور اشد کا شکر ہے جس کی اس نے تائید و نصرت فرمائی، یہاں تک کہ یہ ترقی کر کے اس منزل تک پہنچ گیا۔ ہم سے تو اشد خود فرما چکا ہے وحده اللہ الذین امنوا منکم و عملوا الصالحات یستخلفنہم فی الارض..... اشد اس وعدے کو پورا کر کے رہے گا اور اپنے لشکر کی ضرورت مدد کرے گا۔ اسلام میں قیم کا مقام وہی ہے جو موتیوں کے ہار میں رشتے کا مقام ہے۔ رشتہ ٹوٹتے ہی موتی بکھر جاتے ہیں اور نظم درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اور پر اگندہ ہو جانے کے بعد پھر جمع ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عرب تعداد میں قلیل ہیں۔ مگر اسلام نے ان کو کثیر اور اجتماع نے ان کو قوی بنا دیا ہے۔ آپ یہاں قطب بن کر جے بیٹھے رہیں اور عرب کی چپکی کو اپنے گرد گھماتے رہیں اور یہیں سے بیٹھے بیٹھے جنگ کی آگ بھڑکاتے رہیں۔ ورنہ آپ اگر ایک دفعہ یہاں سے ہٹ گئے تو ہر طرف سے عرب کا نظام ٹوٹنا شروع ہو جائے گا اور نوبت یہ آجائے گی کہ آپ کو سامنے کے دشمنوں کی

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، لازم ہے کہ تمہارے مملوک اور تمہارے بچے جو ابھی عقل کی حد کو نہیں پہنچے ہیں، تین اوقات میں اجازت لے کر تمہارے پاس آیا کریں: صبح کی نماز سے پہلے، اور دوپہر کو جب کہ تم کپڑے اتار کر رکھ دیتے ہو، اور عشاء کی نماز کے بعد۔ یہ تین وقت

یہ نسبت پیچھے کے خطرات کی زیادہ فکر لاحق ہوگی۔ اور ادھر ایرانی آپ ہی کے اوپر نظر جمادیں گے کہ یہ عرب کی جڑ ہے، اسے کاٹ دو تو بیڑا پار ہے، اس لیے وہ سارا زور آپ کو ختم کر دینے پر لگا دیں گے۔ رہی وہ بات جو آپ نے فرمائی ہے کہ اس وقت اہل عجم بڑی کثیر تعداد میں امنڈ آئے ہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے پہلے بھی ہم جو ان سے لڑتے رہے ہیں تو کچھ کثرتِ تعداد کے بل پر نہیں لڑتے رہے ہیں، بلکہ اللہ کی تائید و نصرت ہی نے آج تک ہمیں کامیاب کرایا ہے۔“

دیکھنے والا خود ہی دیکھ سکتا ہے کہ اس تقریر میں جناب امیر کس کو آیت استخلاف کا مصداق بھٹرا رہے ہیں۔ کفر سے مراد یہاں کفرانِ نعمت بھی ہو سکتا ہے اور انکارِ حق بھی۔ پہلے معنی کے لحاظ سے اس کے مصداق وہ لوگ ہوں گے جو نعمتِ خلافت پانے کے بعد طریقِ حق سے ہٹ جائیں۔ اور دوسرے معنی کے لحاظ سے اس کے مصداق منافقین ہوں گے جو اللہ کا یہ وعدہ سن لینے کے بعد بھی اپنی منافقانہ روش نہ چھوڑیں۔

یہاں سے پھر احکامِ معاشرت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ بعید نہیں کہ سورہ نور کا یہ حصہ اوپر کی تقریر کے کچھ مدت بعد نازل ہوا ہو۔

یہ جمہور مفسرین و فقہاء کے نزدیک اس سے مراد لونڈیاں اور غلام دونوں ہیں، کیونکہ لفظ عام استعمال کیا گیا ہے۔ مگر ابن عمر اور مجاہد اس آیت میں مملوکوں سے مراد صرف غلام لینے ہیں اور لونڈیوں کو اس سے مستثنیٰ کرتے ہیں۔ حالانکہ آگے جو حکم بیان کیا گیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے اس تخصیص کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ تخلیق کے اوقات میں جس طرح خود اپنے بچوں کا اچانک آجانا مناسب نہیں اسی طرح خادمہ کا بھی آجانا غیر مناسب ہے۔

تمہارے لیے پردے کے وقت ہیں۔ ان کے بعد وہ بلا اجازت آئیں تو نہ تم پر کوئی گناہ ہے نہ ان پر، تمہیں ایک دوسرے کے پاس بار بار آنا ہی ہوتا ہے۔ اس طرح اللہ تمہارے لیے

یہ امر متفق علیہ ہے کہ اس آیت کا حکم بالغ و نابالغ دونوں قسم کے مملوکوں کے لیے عام ہے۔

۵۸۵ دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بالغوں کا سا خواب دیکھنے کی عمر کو نہیں پہنچے ہیں۔ اسی سے فقہاء نے لڑکوں کے معاملہ میں احتلام کو بلوغ کا آغاز مانا ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے۔ لیکن جو ترجمہ ہم نے متن میں اختیار کیا ہے وہ اس بنا پر قابل ترجیح ہے کہ یہ حکم لڑکوں اور لڑکیوں، دونوں کے لیے ہے، اور احتلام کو علامتِ بلوغ قرار دینے کے بعد حکم صرف لڑکوں کے لیے خاص ہو جاتا ہے، کیونکہ لڑکی کے معاملہ میں ایام ماہواری کا آغاز علامتِ بلوغ ہے نہ کہ احتلام۔ لہذا ہمارے نزدیک حکم کا منشا یہ ہے کہ جب تک گھر کے بچے اس عمر کو نہ پہنچ جائیں جس میں ان کے اندر صنفی شعور بیدار ہوا کرتا ہے وہ اس قاعدے کی پابندی کریں، اور جب اس عمر کو پہنچ جائیں تو پھر ان کے لیے وہ حکم ہے جو آگے آ رہا ہے۔

۵۸۶ اصل میں لفظ عورات استعمال ہوا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ "یہ تین وقت تمہارے لیے عورات ہیں۔ عورت اردو میں تو صنفِ اناث کے لیے بولا جاتا ہے مگر عربی میں اس کے معنی خلل اور خطرے کی جگہ کے ہیں، اور اس چیز کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جس کا کھل جانا آدمی کے لیے باعثِ شرم ہو یا جس کا ظاہر ہو جانا اس کو ناگوار ہو، نیز اس معنی میں بھی یہ مستعمل ہے کہ کوئی چیز غیر محفوظ ہو۔ یہ سب معنی باہم قریبی مناسبت رکھتے ہیں اور آیت کے معنوم میں کسی نہ کسی حد تک سمجھی شامل ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان اوقات میں تم لوگ تنہا، یا اپنی بیویوں کے ساتھ ایسی حالتوں میں ہوتے ہو جن میں گھر کے بچوں اور خادموں کا اچانک تمہارے پاس آ جانا مناسب نہیں ہے، لہذا ان کو یہ ہدایت کرو کہ ان تین وقتوں میں جب وہ تمہاری خلوت کی جگہ آنے لگیں تو پہلے اجازت لے لیا کریں۔

۵۸۹ یعنی ان تین وقتوں کے سوا دوسرے اوقات میں نابالغ بچے اور گھر کے مملوک ہر وقت حورتوں اور مردوں کے پاس ان کے کمرے میں یا ان کے تخیلیے کی جگہ میں بلا اجازت آ سکتے ہیں۔ اس صورت میں اگر تم کسی نامناسب حالت میں ہو اور وہ بلا اجازت آجائیں تو تمہیں ٹانٹ ڈپٹ کرنے کا حق نہیں ہے، کیونکہ

اپنے ارشادات کی توضیح کرتا ہے، اور وہ عظیم و حکیم ہے۔ اور جب تمہارے بچے عقل کی حد کو پہنچ جائیں تو چاہیے کہ اسی طرح اجازت لے کر آیا کریں جس طرح ان کے بڑے اجازت لیتے ہیں۔ اس طرح اللہ پانی آیات تمہارے سامنے کھوتا ہے۔ اور وہ عظیم و حکیم ہے۔

پھر یہ تمہاری اپنی حماقت ہوگی کہ کام کاج کے اوقات میں اپنے آپ کو ایسی نامناسب حالت میں رکھو۔ البتہ اگر تخیلیے کے مذکورہ بالا تین اوقات میں وہ بلا اجازت آجائیں، تو وہ قصور وار ہیں اگر تمہاری تربیت و تعلیم کے باوجود یہ حرکت کریں، ورنہ تم خود گناہ گار ہو اگر تم نے اپنے بچوں اور مملوکوں کو یہ تہذیب نہیں سکھائی۔

۱۵۔ یہ وجہ ہے اس اجازت عام کی جو تین اوقات مذکورہ کے سوا دوسرے تمام اوقات میں بچوں اور مملوکوں کو بلا اجازت آنے کے لیے دی گئی ہے۔ اس سے اصول فقہ کے اس مسئلے پر روشنی پڑتی ہے کہ شریعت کے احکام مصلحت پر مبنی ہیں، اور ہر حکم کی کوئی نہ کوئی علت ضرور ہے، خواہ وہ بیان کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو۔

۱۶۔ یعنی بالغ ہو جائیں۔ جیسا کہ اوپر حاشیہ نمبر ۸۷ میں بیان کیا جا چکا ہے، لڑکوں کے معاملے میں احتمال اور لڑکیوں کے معاملے میں ایام ماہواری کا آغاز علامت بلوغ ہے۔ لیکن جو لڑکے اور لڑکیاں کسی وجہ سے دیر تک ان جسمانی تغیرات سے خالی رہ جائیں ان کے معاملے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ امام شافعی، امام ابو یوسف، امام محمد اور امام احمد کے نزدیک اس صورت میں ۱۵ برس کے لڑکے اور لڑکی کو بالغ سمجھا جائے گا، اور امام ابو حنیفہ کا بھی ایک قول اس کی تائید میں ہے۔ لیکن امام اعظم کا مشہور قول یہ ہے کہ اس صورت میں ۱۷ برس کی لڑکی اور ۱۸ برس کے لڑکے کو بالغ قرار دیا جائے گا۔ یہ دونوں قول کسی نص پر نہیں بلکہ فقہانہ اجتہاد پر مبنی ہیں، لہذا ضروری نہیں ہے کہ تمام دنیا میں ہمیشہ ۱۵ یا ۱۸ برس کی عمر کی کو غیر محکم لڑکوں اور غیر محکمہ لڑکیوں کے معاملے میں حد بلوغ مانا جائے۔ دنیا کے مختلف ملکوں میں، اور مختلف زمانوں میں جسمانی نشوونما کے حالات مختلف ہوا کرتے ہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ عموماً کسی ملک میں جن عمروں کے لڑکوں اور لڑکیوں کو احتمال اور ایام ماہواری ہونے شروع ہوتے ہوں



اور جو عورتیں جوانی سے گزری بیٹھی ہوں، نکاح کی امید دار نہ ہوں، وہ اگر اپنی چادریں اتار کر

ان کا اوسط فرق نکال لیا جائے، اور پھر جن لڑکوں اور لڑکیوں میں کسی غیر معمولی وجہ سے یہ علامات اپنے معتاد وقت پر نہ ظاہر ہوں ان کے لیے زیادہ سے زیادہ متناظر پر اس اوسط کا اضافہ کر کے اسے بلوغ کی عمر قرار دے دیا جائے۔ مثلاً کسی ملک میں بالعموم کم سے کم ۱۲ اور زیادہ سے زیادہ ۱۵ برس کے لڑکے کو احتلام ہوا کرتا ہو، تو اوسط فرق ڈیڑھ سال ہوگا اور غیر معمولی قسم کے لڑکوں کے لیے ہم ساڑھے سولہ برس کی عمر کو سن بلوغ قرار دے سکیں گے۔ اسی قاعدے پر مختلف ممالک کے اہل قانون اپنے ہاں کے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ایک حد مقرر کر سکتے ہیں۔

۱۵ برس کی حد کے سختی میں ایک حدیث پیش کی جاتی ہے، اور وہ ابن عمر کی یہ روایت ہے کہ میں ۱۴ سال کا تھا جب غزوہ اُحد کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا اور آپ نے مجھے شریک جنگ ہونے کی اجازت نہ دی، پھر غزوہ خندق کے موقع پر، جب کہ میں ۱۵ سال کا تھا، مجھے دوبارہ پیش کیا گیا اور آپ نے مجھ کو اجازت دے دی (صحاح ستہ و مسند احمد)۔ لیکن یہ روایت دو وجوہ سے قابل استدلال نہیں ہے۔ اول یہ کہ غزوہ اُحد شوال ۳ء کا واقعہ ہے اور غزوہ خندق بقول محمد بن اسحاق شوال ۵ء میں اور بقول ابن سعد ذی القعدہ ۵ء میں پیش آیا۔ دونوں واقعات کے درمیان پورے دو سال یا اس سے زیادہ کافرق ہے۔ اب اگر غزوہ اُحد کے زمانے میں ابن عمر ۱۴ سال کے تھے تو کس طرح ممکن ہے کہ غزوہ خندق کے زمانے میں وہ صرف ۱۵ سال کے ہوں؟ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے ۱۳ سال ۱۱ مہینے کی عمر کو ۱۴ سال اور ۱۵ برس ۱۱ مہینے کی عمر کو ۱۵ سال کہہ دیا ہو۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ لڑائی کے لیے بالغ ہونا اور چیز ہے اور معاشرتی معاملات میں قانوناً بالغ ہونا اور چیز۔ ان دونوں میں کوئی لازمی تعلق نہیں ہے کہ ایک کو دوسرے کے لیے دلیل بنایا جاسکے۔ لہذا صحیح یہ ہے کہ غیر مسلم لڑکے کے لیے ۱۵ برس کی عمر مقرر کرنا ایک نیا ہی و اجتہادی حکم ہے، کوئی منصوص حکم نہیں ہے۔

۹۲ اصل میں لفظ قواعد من النساء کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، یعنی عورتوں میں سے جو بیٹھ چکی ہوتی

یا ”بیٹھی ہوئی عورتیں۔ اس سے مراد ہے سن یا اس، یعنی عورت کا اس عمر کو پہنچ جانا جس میں وہ اولاد

۹۳ رکھ دیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں، بشرطیکہ زینت کی نمائش کرنے والی نہ ہوں۔ تاہم وہ بھی حجاب دار رہی  
بتیں تو ان کے حق میں اچھا ہے، اور اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

کوئی حرج نہیں اگر کوئی اندھا، یا لنگڑا، یا مرعوض (کسی کے گھر سے کھالے) اور نہ تمہارے  
اوپر اس میں کوئی مضائقہ ہے کہ اپنے گھروں سے کھاؤ یا اپنے باپ دادا کے گھروں سے، یا اپنی  
ماں نانی کے گھروں سے، یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے، یا اپنی بہنوں کے گھروں سے، یا اپنے  
بچاؤں کے گھروں سے، یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے، یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے، یا  
اپنی خالاؤں کے گھروں سے، یا ان گھروں سے جن کی کنجیاں تمہاری سپردگی میں ہیں، یا اپنے  
دوستوں کے گھروں سے۔ اس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ تم لوگ مل کر کھاؤ، یا

پیدا کرنے کے قابل نہ رہے، اس کی اپنی خواہشات بھی مرچھی ہوں اور اس کو دیکھ کر مردوں میں بھی کوئی صنفی  
جذبہ نہ پیدا ہو سکتا ہو۔ اس کی طرف بعد کا فقرہ اشارہ کر رہا ہے۔

۹۴ اصل الفاظ ہیں یصنعن ثیابہن ایتے کپڑے اتار دیں۔ مگر ظاہر ہے کہ اس سے مراد سارے  
کپڑے اتار کر برہنہ ہو جانا تو نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے تمام فقہاء اور مفسرین نے بالاتفاق اس سے مراد وہ  
چادریں لی ہیں جن سے زینت کو چھپانے کا حکم سورہ احزاب کی آیت یذینن علیہن من جلابہن  
میں دیا گیا تھا۔

۹۴ اصل الفاظ ہیں غیر متعرجات بزینة زینت کے ساتھ تبرج کرنے والی نہ ہوں۔ تبرج کے  
معنی ہیں اظہار و نمائش کے۔ باریج اس کھلی کشتی یا جہاز کو کہتے ہیں جس پر پھت نہ ہو۔ اس معنی میں عورت  
کے لیے یہ لفظ اس وقت بولتے ہیں جب کہ وہ مردوں کے سامنے اپنے حسن اور اپنی آرائش کا اظہار  
کرے۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ چادر اتار دینے کی یہ اجازت ان بڑھی عورتوں کو دی جا رہی ہے،  
جن کے اندر بن ٹھن کر رہنے کا شوق باقی نہ رہا ہو اور جن کے صنفی جذبات سرد پڑ چکے ہوں۔ لیکن  
اگر اس آگ میں کوئی چنگاری ابھی باقی ہو اور وہ نمائش زینت کی شکل اختیار کر رہی ہو تو پھر اس اجازت سے  
فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔

۹۵ اس آیت کو سمجھنے کے لیے تین باتوں کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ اول یہ کہ آیت کے دو حصے ہیں

الگ الگ<sup>۹۶</sup>۔ البتہ جب گھروں میں داخل ہوا کرو تو اپنے لوگوں کو سلام کیا کرو، دعائے خیر، اللہ کی طرف سے مقرر فرمائی ہوئی، بڑی بابرکت اور پاکیزہ۔

پہلا حصہ بیمار، لنگڑے، اندھے اور اسی طرح کے دوسرے معذور لوگوں کے بارے میں ہے، اور دوسرا عام لوگوں کے بارے میں۔ دوم یہ کہ قرآن کی اخلاقی تعلیمات سے اہل عرب کی ذہنیت میں جو زبردست انقلاب واقع ہوا تھا اس کی وجہ سے حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی تمیز کے معاملے میں ان کی حس انتہائی نازک ہو گئی تھی۔ ابن عباس کے بقول، اللہ تعالیٰ نے جب ان کو حکم دیا، کہ لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (ایک دوسرے کے مال ناجائز طریقوں سے نہ کھاؤ) تو لوگ ایک دوسرے کے ہاں کھانا کھانے میں بھی سخت احتیاط برتنے لگے تھے، حتیٰ کہ بالکل قانونی شرطوں کے مطابق صاحب خانہ کی دعوت و اجازت جب تک نہ ہو، وہ سمجھتے تھے کہ کسی عزیز یا دوست کے ہاں کھانا بھی ناجائز ہے۔ سوم یہ کہ اس میں اپنے گھروں سے کھانے کا جو ذکر ہے وہ اجازت دینے کے لیے نہیں بلکہ یہ ذہن نشین کرنے کے لیے ہے کہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ہاں کھانا بھی ایسا ہی ہے جیسے اپنے ہاں کھانا، ورنہ ظاہر ہے کہ اپنے گھر سے کھانے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہ تھی۔ ان تین باتوں کو سمجھ لینے کے بعد آیت کا یہ مطلب واضح ہو جاتا ہے کہ جہاں تک معذور آدمی کا تعلق ہے، وہ اپنی بھوک رفع کرنے کے لیے ہر گھر اور ہر جگہ سے کھا سکتا ہے، اس کی معذوری بجائے خود سارے معاشرے پر اس کا حق قائم کر دیتی ہے، اس لیے جہاں سے بھی اس کو کھانے کے لیے ملے وہ اس کے لیے جائز ہے۔ رہے عام آدمی تو ان کے لیے ان کے اپنے گھر اور ان لوگوں کے گھر جن کا ذکر کیا گیا ہے۔ یکساں ہیں، ان میں سے کسی کے ہاں کھانے کے لیے اس طرح کی شرطوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ صاحب خانہ باقاعدہ اجازت دے تو کھائیں ورنہ خیانت ہوگی۔ آدمی اگر ان میں سے کسی لے ہاں جائے اور گھر کا مالک موجود نہ ہو اور اس کے بیوی بچے کھانے کو کچھ پیش کریں تو بے تکلف کھایا جاسکتا ہے۔

جن رشتہ داروں کے نام یہاں لیے گئے ہیں ان میں اولاد کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا کہ آدمی کی اولاد کا گھر اس کا اپنا ہی گھر ہے دوستوں کے معاملے میں یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ ان سے ملدے بے تکلف اور جگری دوست ہیں جن کی غیر موجودگی میں اگر باریگ ان کا صلوا اڑا جائیں تو ناگوار گزرتا تو درکنار انہیں اس پر الٹی خوشی ہو۔

۹۶ قدیم زمانے کے اہل عرب میں بعض قبیلوں کی تہذیب یہ تھی کہ ہر ایک الگ الگ کھانا لے کر بیٹھے اد کھائے

اس طرح اللہ تعالیٰ تمہارے سامنے آیات بیان کرتا ہے، توقع ہے کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو گے؛  
 مومن تو اصل میں وہی ہیں جو اللہ اور رسول کو دل سے مانیں، اور جب کسی اجتماعی کام کے موقع  
 پر رسول کے ساتھ ہوں تو اُس سے اجازت لیے بغیر نہ جائیں۔ جو لوگ تم سے اجازت مانگتے ہیں  
 وہی اللہ اور رسول کے ماننے والے ہیں، پس جب وہ اپنے کسی کام سے اجازت مانگیں، تو جسے تم چاہو  
 اجازت دے دیا کرو اور ایسے لوگوں کے حق میں اللہ سے دعائے مغفرت کیا کرو، اللہ یقیناً شفور  
 درحیم ہے۔

وہ مل کر ایک ہی جگہ کھانا برا سمجھتے تھے، جیسا کہ مہندوؤں کے ہاں آج بھی برا سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس  
 بعض قبیلے تنہا کھانے کو برا جانتے تھے، حتیٰ کہ ناقہ کر جاتے تھے اگر کوئی ساتھ کھانے والا نہ ہو۔ یہ آیت  
 اسی طرح کی پابندیوں کو ختم کرنے کے لیے ہے۔

۹۷ یہ آخری ہدایات ہیں جو مسلمانوں کی جماعت کا نظم و ضبط پہلے سے زیادہ کس دینے کے لیے دی  
 جا رہی ہیں۔

۹۸ یہی حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے جانشینوں اور اسلامی نظام جماعت کے امراء  
 کا بھی ہے۔ جب کسی اجتماعی مقصد کے لیے مسلمانوں کو جمع کیا جائے، قطع نظر اس سے کہ جنگ کا موقع  
 ہو یا حالت امن کا، بہر حال ان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ امیر کی اجازت کے بغیر واپس چلے جائیں یا منتشر  
 ہو جائیں۔

۹۹ اس میں یہ تشبیہ ہے کہ کسی واقعی ضرورت کے بغیر اجازت طلب کرنا تو سوسے سے ہی نا جائز ہے  
 جواز کا پہلو صرف اس صورت میں نکلتا ہے جب کہ جانے کے لیے کوئی حقیقی ضرورت لاحق ہو۔

۱۰۰ یعنی ضرورت بیان کرتے پر بھی اجازت دینا یا نہ دینا رسول کی، اور رسول کے بعد امیر جماعت  
 کی مرضی پر موقوف ہے۔ اگر وہ سمجھتا ہو کہ اجتماعی ضرورت اس شخص کی انفرادی ضرورت کی بہ نسبت  
 زیادہ اہم ہے تو وہ پورا حق رکھتا ہے کہ اجازت نہ دے، اور اس صورت میں ایک مومن کو اُس سے کوئی شکایت  
 نہیں ہونی چاہیے۔

۱۰۱ اس میں پھر تشبیہ ہے کہ اجازت طلب کرنے میں اگر ذرا سی بہانہ بازی کا بھی دخل ہو، یا اجتماعی

مسلمانو! اپنے درمیان رسول کے بلانے کو آپس میں ایک دوسرے کا سا بلانا نہ سمجھو۔ اللہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو تم میں ایسے ہیں کہ ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے چپکے سے شک جاتے ہیں۔ رسول کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو ڈرنا چاہیے کہ وہ کسی فتنے میں گرفتار ضروریات پر انفرادی ضروریات کو مقدم رکھنے کا جذبہ کارفرما ہو تو یہ ایک گناہ ہے۔ لہذا رسول اور اس کے جانشین کو صرف اجازت دینے ہی پر اکتفا نہ کرنا چاہیے بلکہ جسے بھی اجازت دے، ساتھ کے ساتھ یہ بھی کہہ دے کہ خدا تمہیں معاف کرے۔

۱۱۔ اصل میں لفظ دعاء استعمال ہوا ہے جس کے معنی بلانے کے بھی ہیں اور دعا کرنے اور پکارنے کے بھی نیز دعاء الرسول کے معنی رسول کا بلانا یا دعا کرنا بھی ہو سکتا ہے اور رسول کو پکارنا بھی۔ ان مختلف معنوں کے لحاظ سے آیت کے تین مطلب ہو سکتے ہیں اور تینوں ہی صحیح و معقول ہیں۔

اول یہ کہ رسول کے بلانے کو عام آدمیوں میں سے کسی کے بلانے کی طرح نہ سمجھو۔ یعنی رسول کا بلاوا غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ دوسرا کوئی بلائے اور تم لبیک نہ کہو تو تمہیں آنا دای ہے لیکن رسول بلائے اور تم نہ جاؤ، یا دل میں ذرہ برابر بھی تنگی محسوس کرو، تو ایمان کا خطرہ ہے۔

دوم یہ کہ رسول کی دعا کو عام آدمیوں کی سی دعا نہ سمجھو۔ وہ تم سے خوش ہو کر دعا دیں تو تمہارے لیے اس سے بڑی کوئی نعمت نہیں، اور ناراض ہو کر دعا دے دیں تو تمہاری اس سے بڑھ کر کوئی بد نصیبی نہیں سوچو یہ کہ رسول کو پکارنا عام آدمیوں کے ایک دوسرے کو پکارنے کی طرح نہیں ہے۔ یعنی تم عام آدمیوں کو جس طرح ان کے نام لے کر باواز بلند پکارتے ہو اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ پکارا کرو۔ اس معاملے میں ان کا انتہائی ادب ملحوظ رکھنا چاہیے، کیونکہ ذرا سی بے ادبی بھی اللہ کے ہاں مواخذے سے نہ بچ سکے گی۔

یہ تینوں مطلب اگرچہ معنی کے لحاظ سے صحیح ہیں اور قرآن کے الفاظ تینوں کو شامل ہیں، لیکن بعد کے مضمون سے پہلا مطلب ہی مناسب رکھتا ہے۔

۱۲۔ یہ منافقین کی ایک اور علامت بتائی گئی ہے کہ اسلام کی اجتماعی خدمات کے لیے جیب بلایا جاتا ہے

نہ ہو جائیں یا ان پر دردناک عذاب نہ آجائے۔ خبردار رہو۔ آسمان وزمین میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے۔ تم جس روش پر بھی ہو اللہ اس کو جانتا ہے۔ جس روز تم اس کی طرف پلو گے وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کچھ کر کے آئے ہو۔ وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

ع ۹

تو وہ آتو جاتے ہیں، کیونکہ مسلمانوں میں کسی نہ کسی وجہ سے شامل رہنا چاہتے ہیں، لیکن یہ حاضری ان کو سخت ناگوار ہوتی ہے اور کسی نہ کسی طرح چھپ چھپا کر نکل بھاگتے ہیں۔

اللہ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فتنے کا مطلب "ظالموں کا تسلط" لیا ہے۔ یعنی اگر مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی خلاف ورزی کریں گے تو ان پر عیوب و ظالم حکمران مسلط کر دئے جائیں گے۔ بہر حال فتنے کی یہ بھی ایک صورت ہو سکتی ہے اور اس کے سوا دوسری بے شمار صورتیں بھی ممکن ہیں۔ مثلاً آپس کے تفرقے اور خانہ جنگیاں، اخلاقی زوال، نظام جماعت کی پراگندگی، داخلی انتشار، سیاسی اور مادی طاقت کا ٹوٹ جانا، بیخوں کا محکوم ہو جانا وغیرہ۔